ALLAMA IQBAL OPEN UNIVERSITY

AIOU LIBRARY aioulibrary.com

Name:

Registration No.:

Course Code: 2632

Program: M.A. Islamic Studies

Semester: Autumn 2026

WhatsApp Orders: +92 324 5836626

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

کلیہ عربی وعلوم اسلامیہ (شعبہ فکر اسلامی، تاریخ وثقافت)

کورس: مطالعہ مذاہب عالم (2632) • سطح: ایم اے علوم اسلامیہ

سمسٹر: خزاں 2026

امتحانی مشق نمبر 1 (یونٹ نمبر 1–5)

کل نمبر: 100 • کامیابی کے نمبر: 40

حل شدہ اسائنمنٹ گائیڈ

Reference &For Study — SOLVED ASSIGNMENT GUIDE

نوٹ: یہ گائیڈ صرف مطالعہ اور حوالے کے مقصد کے لیے تیار کی گئی ہے۔ طلبہ کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ کورس کی کتاب کے متعلقہ یونٹس غور سے پڑھیں، تصورات کو اچھی طرح سمجھیں اور پھر اسائنمنٹ اپنے الفاظ میں لکھیں۔ اس گائیڈ کو ہو بہو نقل کرنے کے بجائے اپنی فہم کے مطابق تحریر کریں۔ جہاں کسی دینی یا قانونی مسئلے میں قطعی رائے درکار ہو وہاں اہلِ علم اور مستند علماء کی طرف رجوع کریں۔

کورس کا تعارف اور اس مشق کا جائزہ

مطالعہ مذاہب عالم (2632) ایم اے علوم اسلامیہ کا وہ کورس ہے جو طالب علم کو دنیا کے بڑے مذاہب خصوصاً الہامی مذاہب کی تاریخ، تعلیمات اور باہمی تعلق سے روشناس کراتا ہے۔ امتحانی مشق نمبر 1 (یونٹ نمبر 1 تا 5) میں پانچ سوالات ہیں، ہر سوال 20 نمبر کا ہے؛ کل نمبر 100 اور کامیابی کے نمبر 40 ہیں۔ سوالات بنی اسرائیل کے خروج، فلسطینی عہد، توریت کی قرآنی حیثیت، الہامی مذاہب کے مشترکات اور کتاب خروج کے احکامات عشرہ پر مشتمل ہیں۔ اس گائیڈ میں ہر جواب تعارف، ذیلی عنوانات، جدول و

شکل اور اختتام کے ساتھ دیا گیا ہے۔ تمام مذہبی مباحث خالصتاً علمی و تعلیمی ہیں؛ کسی دینی حکم کا کسی فرد یا واقعے پر اطلاق اہل علم اور باقاعدہ دائرہ اختیار کا کام ہے۔ قرآنی تعلیمات یہاں مفہوم و خلاصے کی صورت میں اپنے الفاظ میں بیان کی گئی ہیں اور احکامات عشرہ بھی مفہوم کے خلاصے کے طور پر پیش کیے گئے ہیں۔ طالب علم جوابات کو سمجھ کر اپنے الفاظ میں لکھے تو یہی اس گائیڈ کا مقصد ہے۔

سوال نمبر 1: بنی اسرائیل کا مصر سے خروج (20 نمبر)

سوال نمبر 1۔ بنی اسرائیل کا مصر سے خروج کی تفصیلات بیان کریں۔ (20)

تعارف

بنی اسرائیل کی تاریخ میں مصر سے خروج وہ مرکزی واقعہ ہے جس کے گرد یہودیت کی مذہبی یادداشت، عیدوں اور شریعت کی روایت گھومتی ہے۔ خروج سے مراد حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قیادت میں بنی اسرائیل کا مصر کی غلامی سے نکلنا ہے، جو توریت کی دوسری کتاب کا بھی اصل موضوع ہے اور اسی مناسبت سے اس کتاب کا نام ہی "خروج" رکھا گیا ہے۔ قرآن مجید میں بھی یہ واقعہ متعدد سورتوں میں بیان ہوا ہے، کیونکہ اس میں ظلم سے نجات، توحید پر ثابت قدمی اور اللہ کی مدد کی واضح تعلیمات موجود ہیں۔ مطالعہ مذاہب کے طالب علم کے لیے خروج کا مطالعہ اس لیے بھی اہم ہے کہ یہ واقعہ محض ایک سیاسی ہجرت نہیں بلکہ ایک قوم کی مذہبی اور قومی تشکیل کا نقطہ آغاز ہے۔ خروج کے بعد ہی بنی اسرائیل کو سینا میں شریعت ملی، ان کا عہد باضابطہ صورت اختیار کر گیا اور وہ ایک غلام قبائلی گروہ سے ایک منظم امت کی صورت میں سامنے آئے۔ اس جواب میں پہلے مصر میں بنی اسرائیل کی آمد اور غلامی کا پس منظر بیان کیا جائے گا، پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پیدائش، نبوت اور فرعون سے مطالبے کے مراحل، اس کے بعد نجات کی رات، بحر قلزم یا بحیرہ احمر کو عبور کرنے کا واقعہ، اور آخر میں خروج کے مذہبی و تاریخی نتائج اور اس سے حاصل ہونے والے اسباق پر بحث کی جائے گی۔

مصر میں آمد اور غلامی کا پس منظر

روایتی بیان کے مطابق بنی اسرائیل مصر میں حضرت یوسف علیہ السلام کے دور میں آئے۔ حضرت یوسف علیہ السلام مصر میں بلند منصب پر فائز ہوئے تو قحط کے زمانے میں ان کے والد حضرت یعقوب علیہ السلام اور ان کے خاندان نے کنعان سے مصر کی طرف ہجرت کی اور وہاں آباد ہو گئے۔ آغاز میں انہیں عزت اور سہولت حاصل رہی، مگر وقت گزرنے کے ساتھ ان کی نسل بڑھتی گئی اور مصر کے حکمران طبقے کا رویہ بدلتا گیا۔ توریت کی کتاب خروج کے آغاز میں بیان کیا گیا ہے کہ مصر میں ایک ایسا بادشاہ برسر اقتدار آیا جو یوسف علیہ السلام کے احسانات سے واقف نہ تھا۔ اسے بنی اسرائیل کی بڑھتی ہوئی تعداد اور طاقت سے خطرہ محسوس ہوا۔ چنانچہ اس نے انہیں کمزور کرنے کے لیے سخت مشقت والے کاموں میں لگا دیا۔ بنی اسرائیل سے اینٹیں بنوانے، تعمیرات اور کھیتوں کے کٹھن کام لیے جانے لگے اور ان کی زندگی تلخ کر دی گئی۔

ظلم کا یہ سلسلہ یہیں نہیں رکا۔ فرعون نے بنی اسرائیل کی آبادی روکنے کے لیے ان کے نوزائیدہ لڑکوں کو قتل کرنے کا حکم بھی دیا، جس کا ذکر توریت میں بھی ہے اور قرآن مجید میں بھی فرعون کے اس ظلم کی طرف اشارہ موجود ہے کہ وہ بنی اسرائیل کے بیٹوں کو ذبح کرتا اور ان کی عورتوں کو زندہ رہنے دیتا تھا۔ مادی غلامی کے ساتھ یہ نسل کشی کی کوشش اس بات کی علامت تھی کہ فرعون بنی اسرائیل کو بطور قوم ختم کرنا چاہتا تھا۔ اس پس منظر کو سمجھنا ضروری ہے کیونکہ خروج کی عظمت اسی وقت واضح ہوتی ہے جب یہ معلوم ہو کہ نجات کس قدر گہرے ظلم اور بے بسی کے بعد ملی۔ ایک کمزور اور نہتی قوم کا ایک طاقتور سامراج کے مقابلے میں نکل کھڑا ہونا، خود روایت کی نظر میں، انسانی تدبیر سے زیادہ الٰہی مدد کا نتیجہ تھا۔ اسی نکتے کو یہودی اور مسلم دونوں روایتیں اپنے اپنے انداز میں اجاگر کرتی ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پیدائش اور پرورش

اسی ظلم کے دور میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پیدائش ہوئی۔ قرآنی بیان کے مطابق ان کی والدہ کو الہام ہوا کہ وہ بچے کو دودھ پلائیں اور جب خطرہ ہو تو اسے دریا میں ڈال دیں، غم نہ کریں، اللہ اسے واپس لوٹائے گا اور اسے رسولوں میں شامل کرے گا۔ توریت اور قرآنی روایت دونوں میں مشترک ہے کہ بچہ صندوق یا ٹوکری کے ذریعے دریا تک پہنچا اور فرعون کے گھر والوں نے اسے اٹھا لیا۔ یوں وہ بچہ جس سے فرعون کو خطرہ تھا، خود فرعون کے محل میں پرورش پانے لگا۔ یہ امر روایت میں الٰہی تدبیر کی نمایاں مثال کے

طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بہن نے حالات پر نظر رکھی اور اسی ذریعے بچے کو اس کی اپنی والدہ کے پاس دودھ پلانے کے لیے پہنچایا گیا، چنانچہ وہ محل میں پروان چڑھے مگر اپنی قوم سے بھی اجنبی نہ رہے۔

جوانی میں ایک واقعہ پیش آیا جس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مصر چھوڑ کر مدین کی طرف جانا پڑا۔ وہاں انہوں نے ایک بزرگ، روایت کے مطابق حضرت شعیب علیہ السلام، کے ہاں قیام کیا اور ان کی صاحبزادی سے شادی ہوئی اور کئی سال مدین میں گزارے۔ واپسی کے سفر میں طور سینا کے قریب انہیں نبوت عطا ہوئی۔ وادی میں آگ نظر آئی اور وہاں اللہ تعالیٰ سے کلام کا شرف حاصل ہوا، عصا اور ید بیضا کے معجزات عطا ہوئے اور حکم ملا کہ فرعون کے پاس جائیں اور بنی اسرائیل کی رہائی کا مطالبہ کریں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی زبان کی دشواری کے سبب اپنے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام کو مددگار بنانے کی درخواست کی جو منظور ہوئی۔ مدین کا قیام اور سینا کا تجربہ اس لیے اہم ہے کہ خروج کار ہنما غلامی ہی کے ماحول سے نہیں بلکہ تنہائی، غور و فکر اور وحی کی تربیت سے گزر کر آیا تھا۔

فرعون سے مطالبہ اور انکار کا مرحلہ

حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام نے فرعون کے دربار میں جا کر دو مطالبات پیش کیے: اللہ کی عبادت کی دعوت اور بنی اسرائیل کو آزاد کر کے اپنے ساتھ جانے کی اجازت۔ فرعون نے تکبر سے اس دعوت کو رد کیا، اپنے آپ کو معبود قرار دینے کے دعوے پر اصرار کیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بچپن کے احسانات جتلائے۔ نشانیاں دکھائی گئیں تو فرعون نے انہیں جادو قرار دیا اور اپنے جادوگروں کو مقابلے پر لایا۔ روایت کے مطابق جادوگروں نے اپنی رسیاں اور لاٹھیاں پھینکیں جو سانپ معلوم ہوئیں، مگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عصا نے انہیں نگل لیا۔ اس واقعے کے بعد جادوگر ایمان لے آئے اور فرعون کی دھمکیوں کے باوجود اپنے ایمان پر قائم رہے۔ یہ مرحلہ بتاتا ہے کہ خروج فوری واقعہ نہیں تھا بلکہ ایک طویل کشمکش کے بعد پیش آیا جس میں حق و باطل کے نمایاں معرکے ہوئے۔

فرعون کے مسلسل انکار کے بعد توریت کی روایت میں مصر پر مختلف آفات کا ذکر آتا ہے جنہیں عموماً دس آفات کہا جاتا ہے، مثلاً پانی کا خون بننا، مینڈکوں، کیڑوں، مکھیوں، مویشیوں کی بیماری، آندھی اور ٹڈی دل کی آفت، گھپ اندھیرا وغیرہ۔ ان آفات کی جزوی تفصیلات توریت میں ہیں اور قرآن مجید میں بھی طوفان، ٹڈی، جوئیں، مینڈک اور

خون کو کھلی نشانیوں کے طور پر ذکر کیا گیا ہے۔ ہر آفت کے وقت فرعون نرمی دکھاتا اور آفت ٹلتے ہی وعدے سے پھر جاتا۔ آخر کار آخری اور فیصلہ کن مرحلہ آیا جس کے بعد فرعون نے بنی اسرائیل کو جانے دیا۔ مطالعہ مذاہب میں ان آفات کو بعض اہل علم قدرتی آفات کی تاریخی یادداشت سے بھی جوڑتے ہیں، مگر روایت کے اپنے بیان میں یہ اللہ کی قدرت کی نشانیاں ہیں جن کا مقصد فرعون کے تکبر کو توڑنا تھا۔ اس اختلاف تعبیر کو طالب علم کو علمی توازن کے ساتھ سمجھنا چاہیے۔

جدول 1: خروج کے واقعے کے بڑے مراحل (روایتی بیان کا خلاصہ)

مختصر تفصیل	مرحلہ
حضرت یوسف علیہ السلام کے دور میں خاندان یعقوب کی مصر آمد	مصر میں آبادکاری
سخت مشقت اور نوزائیدہ لڑکوں کے قتل کا حکم	غلامی اور ظلم
دریا کے ذریعے حفاظت اور فرعون کے محل میں پرورش	موسیٰ علیہ السلام کی پیدائش
مدین کا قیام، سینا میں کلام اور رسالت کی ابتدا	مدین اور نبوت
بنی اسرائیل کی رہائی کا مطالبہ اور فرعون کا انکار	دربار میں مطالبہ
مصر پر آفات اور فرعون کی بار بار وعدہ خلافی	نشانیاں اور آفات
بنی اسرائیل کی روانگی اور سمندر کو عبور کرنا	نجات کی رات اور عبور
شریعت کا نزول اور قوم کی باضابطہ تشکیل	سینا کا عہد

نجات کی رات اور سمندر کا عبور

توریت کے بیان کے مطابق آخری آفت سے پہلے بنی اسرائیل کو ہدایت دی گئی کہ وہ رات کو ایک خاص اہتمام کے ساتھ کھانا کھائیں اور سفر کے لیے تیار رہیں؛ اسی رات کی یاد میں یہودی عید فسح منائی جاتی ہے، جو آج تک خروج کی یاد گار ہے۔ اس کے بعد فرعون اور مصریوں نے بنی اسرائیل کو نکلنے دیا۔ بنی اسرائیل بڑی تعداد میں مصر سے روانہ ہوئے۔ روایتی اعداد و شمار کے بارے میں اہل علم میں بحث موجود ہے اور طالب علم کو چاہیے کہ وہ روایتی اعداد کو روایت ہی کے طور پر پیش کرے، قطعی تاریخی شماریات کے طور پر نہیں۔ روانگی کے تھوڑی دیر بعد فرعون نے ارادہ بدل لیا اور لشکر لے کر پیچھا کیا۔ بنی اسرائیل سمندر کے کنارے پھنس گئے؛ آگے پانی اور پیچھے لشکر تھا۔ اس موقع پر قوم گھبرائی مگر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ پر توکل کا اعلان کیا۔

قرآن اور توریت دونوں کی روایت میں مشترک مرکزی نکتہ یہ ہے کہ اللہ کے حکم سے سمندر میں راستہ بن گیا اور بنی اسرائیل سلامتی سے پار ہو گئے، جبکہ پیچھا کرتا ہوا فرعون اور اس کا لشکر غرق ہو گیا۔ قرآن مجید میں فرعون کے غرق کے وقت کے ایمان کو بھی ذکر کیا گیا ہے اور اس کی نعش کو نشانی قرار دینے کا بیان بھی آتا ہے۔ یہ واقعہ خروج کا نقطہ عروج ہے۔ اس کے بعد بنی اسرائیل صحرا سینا میں داخل ہوئے، جہاں انہیں من و سلویٰ جیسی نعمتوں کا ذکر روایت میں ملتا ہے، پانی کی فراہمی کے واقعات پیش آئے اور پھر طور سینا پر شریعت اور احکامات عشرہ عطا ہوئے، جن کی تفصیل اسی مشق کے پانچویں سوال میں آئے گی۔ صحرائی دور کی مشکلات، قوم کی شکایات اور تربیت کے مراحل خود ایک مستقل موضوع ہیں، مگر خروج کی تکمیل اسی وقت سمجھی جاتی ہے جب قوم غلامی سے نکل کر شریعت یافتہ جماعت بن گئی۔



شکل 1: بنی اسرائیل کی تاریخ کا خطِ زمانی — مصر سے فلسطین تک (مطالعے کے لیے خاکہ)

خروج کے مذہبی و تاریخی نتائج

خروج کے نتائج کو تین سطحوں پر سمجھا جاسکتا ہے۔ مذہبی سطح پر خروج نے یہودی ایمان کی بنیاد رکھ دی: یہودی اپنے آپ کو اسی واقعے کی نسبت سے اللہ کی برگزیدہ اور نجات یافتہ قوم سمجھتے ہیں اور عید فسح ہر سال اس کی یاد تازہ کرتی ہے۔ [illegible] کا تصور، سبت کا ادارہ اور شریعت کی مرکزیت سب اسی واقعے سے جڑے ہیں۔ قومی سطح پر خروج نے منتشر قبائل کو ایک قوم بنایا اور ارض موعود یعنی فلسطین کی طرف ان کا رخ متعین کر دیا جس کی تفصیل اگلے سوال میں آئے گی۔ اخلاقی سطح پر خروج نے بعد کی تمام الہامی روایتوں میں ظالم سے نجات اور مظلوم کی حمایت کو الٰہی صفت کے طور پر پیش کیا؛ یہی سبب ہے کہ [illegible] کے بعد عیسائیت اور اسلام کی تعلیمات میں بھی سبق آموز حوالے کے طور پر زندہ رہا۔

تاریخی و تنقیدی مطالعے میں خروج کے زمانے اور جزئیات پر محققین میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض محققین اسے تیرھویں صدی قبل مسیح کے لگ بھگ کا واقعہ قرار دیتے ہیں اور مصر کے فرعونوں میں سے کسی ایک سے جوڑنے کی کوشش کرتے ہیں، جبکہ بعض اس کی روایتی وسعت پر سوالات اٹھاتے ہیں۔ طالب علم کے لیے مناسب رویہ یہ ہے کہ وہ دینی روایت کی اہمیت کو بھی سمجھے اور علمی بحث کے وجود سے بھی آگاہ رہے۔ پاکستانی جامعات کے مطالعہ مذاہب کے نصاب میں خروج کو بنیادی طور پر یہودی و قرآنی روایت کے تناظر میں پڑھایا جاتا ہے اور یہی اس جواب کا زاویہ ہے۔ یہ بھی یاد رہے کہ خروج کی اصل تعلیم نسل یا قوم کی برتری نہیں بلکہ توحید، صبر، توکل اور عدل ہیں، اور یہی تعلیمات اس واقعے کو آج بھی زندہ رکھتی ہیں۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ بنی اسرائیل کا مصر سے خروج ایک طویل عمل تھا جس میں غلامی اور نسل کشی کے ظلم سے لے کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ولادت و پرورش، مدین کا قیام، نبوت و کلام، فرعون سے کشمکش، آفات، نجات کی رات اور سمندر کے عبور تک کے مراحل شامل ہیں۔ اس واقعے نے ایک غلام قوم کو شریعت یافتہ امت میں بدلا، یہودی مذہبی

تقویم اور عیدوں کو بنیاد فراہم کی اور بعد کی الہامی روایتوں کے لیے نجات کی مستقل مثال قائم کر دی۔ اسی لیے توریت کی پوری کتاب اسی واقعے کے نام سے موسوم ہے اور قرآن مجید نے بھی اس کے تذکرے کو اخلاقی و توحیدی اسباق کے ساتھ بار بار دہرایا ہے۔

سوال نمبر 2: بنی اسرائیل کا فلسطینی عہد (20 نمبر)

سوال نمبر 2۔ بنی اسرائیل کا فلسطینی عہد تفصیل سے بیان کریں۔ (20)

تعارف

بنی اسرائیل کا فلسطینی عہد اس طویل دور کا نام ہے جو مصر سے خروج اور صحرائی زندگی کے بعد ارض کنعان یعنی فلسطین میں داخلے سے شروع ہوتا ہے اور رومی دور تک کی یہودی تاریخ کے کئی بڑے ادوار پر محیط ہے۔ یہی وہ سرزمین ہے جسے یہودی روایت میں اللہ کی طرف سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد سے وعدہ کی گئی سرزمین سمجھا جاتا ہے، اس لیے اس عہد کا مطالعہ محض سیاسی تاریخ نہیں بلکہ مذہبی عہد، شریعت اور قومی شناخت کا مطالعہ بھی ہے۔ اس عہد میں قاضیوں کا دور، متحدہ بادشاہت کا قیام، حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام کا عہد، سلطنت کی تقسیم، انبیا کی تحریکیں، بابلی جلاوطنی، واپسی اور ہیکل کی تعمیر نو، یونانی اور پھر رومی تسلط جیسے بڑے مراحل شامل ہیں۔ قرآن مجید میں بھی اس سرزمین کو مبارک قرار دیا گیا ہے اور بنی اسرائیل کے اس عہد کے نمایاں واقعات، خصوصاً حضرت داؤد و سلیمان علیہما السلام اور طالوت و جالوت کا واقعہ، تفصیل سے بیان ہوئے ہیں۔ اس جواب میں فلسطینی عہد کو مرحلہ وار بیان کیا جائے گا تاکہ طالب علم کو اس طویل تاریخ کی ایک مربوط تصویر مل سکے۔ ساتھ یہ تنبیہ بھی ضروری ہے کہ یہ بیان خالص علمی و تاریخی نوعیت کا ہے؛ آج کے سیاسی تنازعات پر اس تاریخی مطالعے کا اطلاق ایک الگ اور حساس معاملہ ہے جس میں مؤقف سازی کے بجائے علمی دیانت برتنی چاہیے۔

ارض موعود میں داخلہ

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد قیادت حضرت یوشع بن نون کو ملی، جن کا ذکر یہودی روایت میں موسیٰ کے جانشین کے طور پر آتا ہے۔ ان کی قیادت میں بنی اسرائیل دریائے اردن عبور کر کے کنعان میں داخل ہوئے۔ توریت کی کتاب یوشع میں اس داخلے اور مختلف شہروں کی فتح کا بیان ملتا ہے۔ داخلے کے بعد زمین کو بنی اسرائیل کے بارہ قبائل میں تقسیم کیا گیا۔ ہر قبیلے کو ایک خطہ الاٹ ہوا اور یوں قبائلی نظام فلسطین میں مستقر ہو گیا۔ اس تقسیم نے بعد کی پوری تاریخ پر اثر ڈالا، کیونکہ قومی وحدت کے باوجود قبائلی شناختیں مضبوط رہیں اور بحران کے زمانوں میں یہی شناختیں تقسیم کا سبب بھی بنیں۔ ارض میں داخلے کے ساتھ یہ تصور بھی پختہ ہوا کہ اس زمین پر قیام عہد کی پابندی سے مشروط ہے؛ شریعت سے انحراف کو جلاوطنی اور زوال کی دینی توجیہ کے طور پر پیش کیا جاتا رہا۔

یہ نکتہ سمجھنا بھی ضروری ہے کہ فلسطین اس زمانے میں خالی زمین نہیں تھی۔ وہاں کنعانی، فلسطی اور دیگر اقوام آباد تھیں جن کے ساتھ بنی اسرائیل کے تعلقات کبھی جنگ اور کبھی ہمسائیگی کے رہے۔ جدید آثار قدیمہ کے محققین داخلے کی نوعیت اور زمانے پر مختلف آراء رکھتے ہیں؛ بعض تدریجی آبادکاری کا نظریہ پیش کرتے ہیں۔ علمی مطالعے میں روایتی بیان اور آثار قدیمہ کی بحث دونوں کا ذکر کرنا چاہیے، مگر نصابی سطح پر روایتی تاریخ ہی جواب کی بنیاد ہوتی ہے۔ داخلے کے بعد بنی اسرائیل کو اپنی شناخت ایک زرعی اور شہری معاشرے میں قائم رکھنے کا نیا چیلنج درپیش ہوا، کیونکہ صحرائی سادگی کی جگہ اب کنعانی شہری تہذیب کے اثرات آنے لگے تھے اور انبیا کی تنبیہات کا ایک بڑا موضوع یہی ثقافتی و دینی اثرات رہے۔

قاضیوں کا دور

داخلے کے بعد تقریباً اڑھائی صدی کا دور قاضیوں کا دور کہلاتا ہے۔ اس دور میں کوئی مرکزی بادشاہ نہیں تھا؛ ہر قبیلہ اپنے معاملات خود چلاتا تھا اور ضرورت کے وقت اللہ کی طرف سے ایک رہنما اٹھتا تھا جسے قاضی کہا گیا ہے، جو قوم کو دشمن سے نجات دلاتا اور انصاف قائم کرتا تھا۔ توریت کی کتاب قضاۃ میں ان قاضیوں کے واقعات بیان ہوئے ہیں جن میں جدعون اور سمسون جیسی شخصیات نمایاں ہیں۔ اس دور کی خصوصیت انارکی اور بار بار کے انحطاط کا چکر ہے: قوم بدعملی کا شکار ہوتی، دشمن مسلط ہوتا، قوم توبہ کرتی اور

ایک نجات دہندہ کے ذریعے سکون پاتی، پھر دوبارہ انحطاط شروع ہو جاتا۔ یہ چکر یہودی تاریخ نگاری کے اس بنیادی اصول کو ظاہر کرتا ہے کہ قومی عروج و زوال کو شریعت سے وفاداری یا انحراف سے جوڑا گیا ہے۔

اسی دور کے آخری بڑے قاضی حضرت سموئیل علیہ السلام سمجھے جاتے ہیں، جن کے دور میں قوم نے بادشاہ کا مطالبہ کیا۔ روایت کے مطابق وہ اس مطالبے کو اللہ کی حاکمیت سے منہ موڑنے کے مترادف سمجھتے تھے، مگر قوم کے اصرار پر طالوت کو بادشاہ مقرر کیا گیا۔ قرآن مجید میں طالوت کا واقعہ تفصیل سے بیان ہوا ہے کہ کس طرح بنی اسرائیل نے اپنے نبی سے بادشاہ مقرر کرنے کی درخواست کی، طالوت کے انتخاب پر اس کے مالدار نہ ہونے کا اعتراض ہوا، اور پھر طالوت کی قیادت میں جالوت کے لشکر سے مقابلہ ہوا جس میں نوجوان داؤد علیہ السلام نے جالوت کو قتل کیا۔ یہ واقعہ فلسطینی عہد میں بادشاہت کے انداز کا سنگ میل ہے اور قرآنی بیان اسے قیادت کے لیے مال کے بجائے علم اور جسمانی و ذہنی صلاحیت کو معیار قرار دے کر پیش کرتا ہے۔

متحد بادشاہت: داؤد و سلیمان علیہما السلام

طالوت کے بعد حضرت داؤد علیہ السلام بادشاہ ہوئے اور انہیں فلسطینی عہد کا سب سے نمایاں حکمران سمجھا جاتا ہے۔ انہوں نے یروشلم کو فتح کر کے اسے دارالحکومت بنایا، قبائل کو متحد کیا، ارد گرد کی دشمن قوتوں کو مغلوب کیا اور سلطنت کو وسعت دی۔ قرآن مجید میں حضرت داؤد علیہ السلام کو اللہ کا خلیفہ کہا گیا ہے، انہیں زبور عطا ہوئی، پہاڑ اور پرندے ان کے ساتھ تسبیح میں شریک بیان ہوئے ہیں اور لوہے کو ان کے لیے نرم کیے جانے کا ذکر بھی آتا ہے۔ یہودی روایت میں وہ مثالی بادشاہ اور مسیحا کے جد کی حیثیت رکھتے ہیں، جبکہ قرآن انہیں نبی، عادل حکمران اور ذکر و عبادت گزار بندے کے طور پر پیش کرتا ہے۔ دونوں روایتوں کے زاویے مختلف مگر شخصیت کا تقدس مشترک ہے۔

حضرت داؤد علیہ السلام کے بعد ان کے بیٹے حضرت سلیمان علیہ السلام تخت نشین ہوئے، جن کا عہد فلسطینی دور کا عروج سمجھا جاتا ہے۔ ان کے دور میں یروشلم میں عظیم ہیکل یعنی عبادت گاہ تعمیر ہوئی جو یہودی عبادت کا مرکز بن گئی، تجارت کو فروغ ملا، دور دراز سے سفارتی تعلقات قائم ہوئے اور ملکہ سبا کی آمد جیسے واقعات روایت کا حصہ بنے۔ قرآن مجید میں حضرت سلیمان علیہ السلام کی سلطنت، جنات و ہواؤں کی تسخیر، پرندوں کی بولی سمجھنے اور چیونٹی کی بات سننے جیسے واقعات کی تفصیل آتی ہے اور ساتھ یہ واضح کیا گیا ہے

کہ یہ سب اللہ کی عطا تھی اور انہوں نے اس پر شکر کیا۔ ہیکل سلیمانی کی تعمیر فلسطینی عہد کی سب سے بڑی مذہبی علامت ہے جس کی یاد آج تک یہودی روایت میں زندہ ہے۔ اسی عہد میں سلطنت کی انتظامی و معاشی شان اپنے نقطہ عروج پر پہنچی۔

جدول 2: فلسطینی عہد کے بڑے مراحل

مرحلہ	ماما[illegible]عیات
داخلہ و آبادکاری	یوشع بن نون کی قیادت، قبائل میں زمین کی تقسیم
قاضیوں کا دور	غیر مرکزی نظام، انحطاط و نجات کا دوری چکر
متحدہ بادشاہت	طالوت، داؤد و سلیمان علیہما السلام، یروشلم دارالحکومت
ہیکل کی تعمیر	حضرت سلیمان علیہ السلام کے دور میں مرکزی عبادت گاہ
تقسیم سلطنت	شمالی اسرائیل اور جنوبی یہودا کی الگ ریاستیں
انبیا کا دور	اخلاقی و سماجی انحراف پر تنبیہ اور اصلاح کی کوشش
بابلی جلاوطنی	یروشلم و ہیکل کی تباہی، بابل کی طرف جلاوطنی
واپسی و تعمیر نو	فارسی دور میں واپسی اور دوسرے ہیکل کی تعمیر

سلطنت کی تقسیم اور انبیا کا دور

حضرت سلیمان علیہ السلام کے بعد سلطنت دو حصوں میں بٹ گئی: شمال میں دس قبائل کی ریاست اسرائیل جس کا دارالحکومت بعد میں سامریہ بنا، اور جنوب میں یہودا کی چھوٹی ریاست جس کا مرکز یروشلم رہا۔ تقسیم کی وجوہات میں بھاری ٹیکسوں، جبری مشقت اور قبائلی رقابتوں کا ذکر روایات میں آتا ہے۔ دونوں ریاستوں کا دور باہمی جنگوں، غیر ملکی

دباؤ اور مذہبی انحراف سے عبارت رہا۔ اسی دور میں بنی اسرائیل کے بڑے انبیا کی ایک طویل فہرست سامنے آتی ہے جن میں حضرت الیاس، الیسع، اشعیا، یرمیاہ اور دیگر شامل ہیں۔ ان انبیا کی دعوت کا مرکز بت پرستی کی مخالفت، سماجی انصاف، یتیم و مسکین کے حقوق اور حکمرانوں کی بد عملی پر گرفت تھا۔ یہودی صحائف کا بڑا حصہ اسی دور کی تحریروں پر مشتمل ہے اور یہ دور بتاتا ہے کہ فلسطینی عہد صرف بادشاہوں کی تاریخ نہیں بلکہ نبوی تنقید و اصلاح کی تاریخ بھی ہے۔

آخر کار شمالی ریاست کو آٹھویں صدی قبل مسیح میں آشوری سلطنت نے ختم کر دیا اور اس کے باشندوں کو جلاوطن کر دیا گیا، جبکہ جنوبی ریاست یہودا چھٹی صدی قبل مسیح کے آغاز میں بابل کے بادشاہ بخت نصر کے ہاتھوں تباہ ہوئی۔ یروشلم فتح ہوا، ہیکل مسمار کر دیا گیا اور ہزاروں کی بڑی تعداد کو بابل جلاوطن کر دیا گیا۔ جلاوطنی یہودی تاریخ کا سب سے بڑا سانحہ سمجھی جاتی ہے۔ اس دور میں یہودی شناخت معبد کے بغیر قائم رکھنے کا مسئلہ پیدا ہوا جس سے کنیسہ یعنی مقامی عبادت خانے کے ادارے اور توریت کے مطالعے کو مرکزیت ملی۔ یوں فلسطینی عہد کی سیاست شکست پر ختم ہوئی مگر مذہب نے نئی اداراتی صورت میں اپنے آپ کو زندہ رکھا اور یہی اس تاریخ کا سب سے اہم سبق ہے۔

واپسی، دوسرا ہیکل اور بعد کے ادوار

فارس کے بادشاہ خورس یا سائرس نے بابل فتح کیا تو یہودیوں کو واپسی کی اجازت ملی۔ واپس آنے والوں نے یروشلم میں دوسرا ہیکل تعمیر کیا اور حضرت عزرا علیہ السلام کی قیادت میں توریت کو عوامی زندگی کا مرکز بنانے کی تحریک چلی۔ یہ دور اس لیے اہم ہے کہ اس میں یہودیت نے اپنی تحریری و قانونی صورت کو مضبوط کیا۔ اس کے بعد فلسطین سکندر اعظم کی فتح کے نتیجے میں یونانی دنیا کا حصہ بنا، پھر بطلیموس اور سلوکی ریاستوں کے درمیان رہا۔ سلوکی حکمران کی طرف سے مذہبی جبر کے خلاف مکابی بغاوت ہوئی جس سے ایک خود مختار یہودی ریاست حشمونی دور میں کچھ عرصے کے لیے قائم رہی۔ آخر میں رومی مداخلت سے فلسطین رومی سلطنت کا صوبہ بن گیا اور پہلی و دوسری صدی عیسوی کی بغاوتوں کے بعد دوسرا ہیکل بھی تباہ ہوا اور یہودی بڑے پیمانے پر دنیا میں منتشر ہو گئے۔ یوں فلسطینی عہد اپنے طویل دورانیے کے ساتھ اختتام کو پہنچا۔

اس پورے عہد کا خلاصہ یہ ہے کہ فلسطین بنی اسرائیل کے لیے محض جغرافیہ نہیں تھا بلکہ ان کے عہد، شریعت، بادشاہت اور عبادت کا مرکز تھا۔ اسی سرزمین میں ان کا سب سے بڑا مذہبی مرکز قائم ہوا، ان کے انبیا کی اکثریت یہیں مبعوث ہوئی اور ان کے صحائف کی تدوین کا بڑا کام یہیں انجام پایا۔ عیسائیت کا ظہور بھی اسی سرزمین سے ہوا اور اسلام

میں بھی اس خطے کو، خصوصاً مسجد اقصیٰ کو، خصوصی تقدس حاصل ہے۔ اس لیے فلسطینی عہد کا مطالعہ تینوں الہامی مذاہب کی باہمی تاریخ سمجھنے کے لیے ناگزیر ہے۔ طالب علم کو یہ بھی ذہن میں رکھنا چاہیے کہ تاریخی واقعات کا علمی بیان اور آج کی سیاست دو الگ میدان ہیں اور مطالعہ مذاہب کے طالب علم کی ذمہ داری حقائق کو علمی دیانت سے پیش کرنا ہے۔

نتیجہ

اختتاماً یہ کہا جا سکتا ہے کہ بنی اسرائیل کا فلسطینی عہد داخلے و آبادکاری سے شروع ہو کر قانون، متحدہ بادشاہت، ہیکل سلیمانی، تقسیم، انبیا کی اصلاحی تحریکوں، بابلی جلاوطنی، واپسی اور دوسرے ہیکل سے گزرتا ہوا رومی دور تک پھیلا ہوا ہے۔ اس عہد نے یہودی مذہب کو اس کی کلاسیکی صورت عطا کی اور تین بڑے الہامی مذاہب کی مشترکہ تاریخ کی بنیاد فراہم کی۔ حضرت داؤد و سلیمان علیہما السلام کا عہد اس کا سنہری دور اور جلاوطنی اس کا سب سے بڑا امتحان تھا، مگر دونوں صورتوں میں توریت سے وابستگی نے اس قوم کی شناخت قائم رکھی۔ یہی اس طویل عہد کی تاریخ کا مرکزی نکتہ ہے۔

سوال نمبر 3: قرآن حکیم کے نزدیک توریت کی حیثیت (20 نمبر)

سوال نمبر 3۔ قرآن حکیم کے نزدیک توریت کی حیثیت بیان کریں۔ (20)

تعارف

قرآن حکیم کے نزدیک توریت کی حیثیت سمجھنا مطالعہ مذاہب کا ایک بنیادی مسئلہ ہے کیونکہ اس سے قرآن کا پچھلی آسمانی کتابوں کے ساتھ تعلق واضح ہوتا ہے۔ قرآن مجید اپنے بارے میں بھی یہی کہتا ہے کہ وہ نئی اور اجنبی تعلیم نہیں لایا بلکہ پچھلی وحی کی تصدیق کرتا ہے اور اس کا نگہبان ہے۔ توریت سے قرآن کی مراد وہ وحی ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل فرمائی، نہ کہ لازمی طور پر آج دستیاب متن کی ہر جزئی۔ اس فرق کو سمجھے بغیر اس موضوع میں الجھن پیدا ہوتی ہے۔ مسلمان اہل علم عموماً یہی

موقف رکھتے ہیں کہ اصل توریت الہامی کتاب تھی، اس میں ہدایت اور نور تھا، مگر بعد کے ادوار میں اس کے متن میں کمی بیشی اور تعبیراتی تبدیلیوں کا مسئلہ پیدا ہوا۔ قرآن ایک طرف توریت کو عظمت سے یاد کرتا ہے اور دوسری طرف یہود کے بعض علماء پر کلام میں تحریف کا الزام بھی بیان کرتا ہے۔ اس جواب میں پہلے توریت بحیثیت وحی کا قرآنی تصور بیان کیا جائے گا، پھر اس کے اوصاف ہدایت، نور و فرقان، اس کی تصدیق و نگہبانی کا قرآنی اصول، تحریف کے الزام کی نوعیت اور آخر میں ایک متوازن خلاصہ پیش کیا جائے گا۔ یہ بحث خالص علمی ہے اور کسی فریق کی دل آزاری اس کا مقصد نہیں۔

توریت بحیثیت نازل کردہ کتاب

قرآن مجید نے واضح طور پر بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کتاب عطا فرمائی۔ سورہ بنی اسرائیل اور دیگر مقامات پر موسیٰ علیہ السلام کو کتاب دیے جانے کا ذکر آتا ہے اور اس کتاب کو بنی اسرائیل کے لیے ہدایت قرار دیا گیا ہے۔ اسی طرح قرآن میں توریت کے نزول کو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نزول قرآن کے مشابہ ایک معلوم حقیقت کے طور پر پیش کیا گیا ہے، یہاں تک کہ کفار مکہ کی طرف سے کتاب کے مطالبے کے جواب میں بھی توریت لانے والے کا حوالہ آیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن توریت کی اصل کو الہامی تسلیم کرتا ہے اور اس پر ایمان کو ایمان بالرسل والکتب کا حصہ قرار دیتا ہے۔ مسلمان کے لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ اصل وحی کی توہین کرے، کیونکہ قرآن نے خود یہ سکھایا ہے کہ مومن اس پر ایمان لاتے ہیں جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا اور جو ان سے پہلے نازل ہوا۔

قرآن یہ بھی بیان کرتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کو الواح عطا ہوئیں جن میں ہر چیز کی نصیحت اور تفصیل تھی۔ احکامات عشرہ جن کا ذکر اس مشق کے پانچویں سوال میں آئے گا، اسی روایت سے جڑے ہیں۔ قرآن کے اس بیان سے توریت کا شریعتی کردار ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بنی اسرائیل کے لیے صرف عقائد کی کتاب نہیں تھی بلکہ ان کی انفرادی و اجتماعی زندگی کی قانونی رہنما بھی تھی۔ یہودی فقہ کی پوری روایت اسی بنیاد پر قائم ہے۔ یہاں یہ فرق یاد رکھنا ضروری ہے کہ قرآن کی نظر میں ہر آسمانی کتاب اپنے دور اور اپنی قوم کے لیے ہدایت تھی اور قرآن خود تمام انسانوں کے لیے آخری اور محفوظ وحی ہے۔ اس عقیدے کو قرآن ماضی کی وحی کی نفی نہیں بلکہ اس کی تکمیل و حفاظت کے دعوے کے ساتھ پیش کرتا ہے۔

توریت کے قرآنی اوصاف: ہدایت، نور اور امام

سورہ مائدہ میں توریت کے بارے میں قرآن کا سب سے جامع بیان آیا ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ ہم نے توریت نازل کی جس میں ہدایت اور نور تھا، انبیا اسی کے مطابق فیصلے کرتے تھے اور اہل علم و اولیاء کو اس کتاب کی حفاظت سونپی گئی تھی۔ اس ایک بیان سے تین باتیں معلوم ہوتی ہیں: اول یہ کہ توریت اپنے اصل میں سراپا ہدایت و نور تھی، اس کی تعلیمات انسانوں کی فلاح کے لیے تھیں۔ دوم یہ کہ انبیا و صالحین کی عملی زندگی اسی کے تابع تھی، یعنی توریت کا مقام محض رسمی نہ تھا۔ سوم یہ کہ اس کی حفاظت کی ذمہ داری اس کے اہل علم کو سونپی گئی تھی اور اسی ذمہ داری کی روشنی میں بعد کی کوتاہیوں پر گرفت بھی کی گئی۔ قرآن نے دوسرے مقامات پر توریت کے بعد آنے والی کتاب زبور اور انجیل کو بھی اسی سلسلے کی کڑیاں قرار دیا ہے اور انجیل میں بھی ہدایت و نور کا ذکر کیا ہے۔

ایک اور مقام پر قرآن نے موسیٰ علیہ السلام کی کتاب کو امام و رحمت قرار دیا ہے اور قرآن کو اس کی تصدیق کرنے والی کتاب کہا ہے۔ امام سے مراد پیشوا اور رہنما ہے یعنی توریت اپنے زمانے میں لوگوں کی رہنمائی کا معیار تھی۔ اس سے ایک اصول بھی نکلتا ہے کہ قرآن پچھلی کتابوں سے دشمنی کی بنیاد پر نہیں آیا بلکہ ایک تسلسل کے ساتھ آیا ہے۔ اسی تسلسل کی وجہ سے قرآن میں موسیٰ علیہ السلام کا ذکر سب سے زیادہ انبیا میں آیا ہے اور توریت و انجیل کے حوالے دے کر اہل کتاب کو مشترکہ کلمے کی دعوت بھی دی گئی ہے۔ طالب علم کو چاہیے کہ وہ ان دونوں پہلوؤں کو ساتھ رکھے: توریت کا احترام بھی قرآنی تعلیم ہے اور اس کی موجودہ حالت پر قرآنی تنقید بھی۔ دونوں میں سے ایک کو چھوڑ دینا تصویر کو ادھورا کر دیتا ہے۔

جدول 3: توریت کی حیثیت — قرآنی بیان کے نمایاں نکات (مفہوم کا خلاصہ)

خلاصہ	نکتہ
اللہ کی طرف سے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل کردہ کتاب	الہامی اصل
اس میں ہدایت اور نور تھا؛ بنی اسرائیل کے لیے امام و رحمت	اوصاف

انبیاو علماء اس کے مطابق فیصلے کرتے اور زندگی گزارتے تھے	شریعتی کردار
قرآن اس کی تصدیق کرنے والا اور اس پر نگہبان (مہیمن)	قرآن کا تعلق
توریت کی حفاظت اہل علم کو سونپی گئی؛ قرآن کی حفاظت کا ذمہ خود اللہ نے لیا — مسلم عقیدے کے مطابق	تحفظ کا فرق
بعض گروہوں پر الفاظ کی جگہ بدلنے، چھپانے اور تاویل کی کوتاہی کا بیان	تنقیدی پہلو

تصدیق اور نگہبانی کا اصول

قرآن اپنے آپ کو مصدق یعنی پچھلی کتابوں کی تصدیق کرنے والا اور مہیمن یعنی ان پر نگہبان و شاہد قرار دیتا ہے۔ تصدیق کا مفہوم اہل علم یوں بیان کرتے ہیں کہ قرآن پچھلی وحی کی اصل تعلیمات یعنی توحید، نبوت، آخرت، عبادت اور اخلاق کی تائید کرتا ہے اور ان پیشین گوئیوں کو پورا کرتا ہے جن میں آخری نبی کی خبر دی گئی تھی۔ نگہبانی کا مفہوم یہ ہے کہ قرآن اس معیار کی حیثیت رکھتا ہے جس سے پچھلی روایات کے مواد کو پرکھا جائے؛ جو بات قرآن سے ہم آہنگ ہے وہ اصل وحی کی باقیات میں سے سمجھی جائے گی اور جو اس سے متصادم ہے اسے بعد کی تبدیلی یا انسانی آمیزش قرار دیا جائے گا۔ یہ اصول مسلمان محققین کو یہ سہولت دیتا ہے کہ وہ یہودیت کی روایت کا مطالعہ نہ نفی کے رویے سے کریں نہ اندھی تقلید سے، بلکہ تنقیدی احترام کے ساتھ کریں۔

اسی اصول کا ایک عملی نتیجہ یہ بھی ہے کہ قرآن نے اہل کتاب کو دعوت دیتے وقت توریت و انجیل کو خود ان کے ہاتھوں میں موجود کتاب کے طور پر مخاطب کیا اور انہیں حکم دیا کہ وہ ان کتابوں کو قائم رکھیں۔ ایک مقام پر کہا گیا ہے کہ اہل کتاب کسی بنیاد پر نہیں جب تک وہ توریت و انجیل کو قائم نہ کریں۔ اس کا مفہوم مفسرین یہ لیتے ہیں کہ اصل تعلیمات پر عمل ہی دراصل ان کی تصدیق ہے جس کا تقاضا آخری وحی کی پیروی ہے۔ یہاں یہ بھی واضح رہے کہ پچھلی شریعتوں کے مخصوص احکام کے بارے میں مسلم فقہی

بحث میں نسخ کا اصول بھی آتا ہے، مگر یہ اس سوال کا موضوع نہیں۔ اس سوال کا مرکزی نکتہ توریت کی اصل عزت، اس کا ہدایت ہونا اور قرآن کا اس سے تصدیق و نگہبانی کا تعلق ہے، اور یہی نکتہ قرآن کی متعدد آیات سے واضح طور پر ثابت ہے۔

تحریف کا سوال اور علمی توازن

قرآن مجید میں یہود کے بعض گروہوں کے بارے میں یہ بیان بھی آیا ہے کہ وہ الفاظ کو ان کی جگہوں سے ہٹا دیتے ہیں، کتاب کے ایک حصے پر ایمان لاتے اور دوسرے کا انکار کرتے ہیں، اور حق کو چھپاتے ہیں۔ مسلم علماء نے تحریف کی بحث میں عموماً دو اقسام بیان کی ہیں: تحریف لفظی یعنی متن میں تبدیلی، اور تحریف معنوی یعنی الفاظ وہی رکھ کر معنی و مراد بدل دینا یا غلط تاویل کر دینا۔ علماء کی ایک بڑی تعداد کا رجحان یہ ہے کہ تحریف کی اصل شدت معنوی تحریف اور چھپانے و عمل نہ کرنے میں ہے، جبکہ لفظی تبدیلی کے دائرے پر ان میں بحث رہی ہے۔ جدید دور میں متقدین بھی یہودی صحائف کی تدوینی تاریخ کو ایک طویل عمل قرار دیتے ہیں جس میں ادوار کے اثرات شامل ہوئے۔ اس علمی بحث کو پیش کرتے ہوئے یہ خیال رکھنا چاہیے کہ الزام پوری قوم پر نہیں بلکہ مخصوص گروہوں اور رویوں پر ہے، اور قرآن نے خود اہل کتاب میں نیک و مخلص لوگوں کی تعریف بھی کی ہے۔

قرآن کا یہ متوازن انداز آج کے بین المذاہب مطالعے کے لیے بھی رہنما ہے۔ ایک طرف وہ پچھلی وحی کی عظمت کو برقرار رکھتا ہے جس سے مکالمے کی مشترکہ بنیاد بنتی ہے، اور دوسری طرف وہ تنقیدی سوالات بھی اٹھاتا ہے جن سے علمی بحث آگے بڑھتی ہے۔ دونوں مذاہب کے جدید محققین اس موضوع پر وسیع لٹریچر تیار کر چکے ہیں اور طالب علم کو چاہیے کہ وہ کسی بھی جذباتیت سے بچ کر نصوص اور تاریخ کی روشنی میں رائے قائم کرے۔ یہ بھی ذہن نشین رہے کہ دینی احکام کا اطلاق اور کسی فرد کے ایمان کا فیصلہ کرنا مطالعہ مذاہب کے طالب علم کا کام نہیں؛ یہاں صرف تعلیمی بیان مقصود ہے اور قطعی دینی آراء میں اہل علم کی طرف رجوع ہی درست طریقہ ہے۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ قرآن حکیم کے نزدیک توریت اللہ کی نازل کردہ الہامی کتاب ہے جس میں ہدایت اور نور تھا، جو بنی اسرائیل کے لیے امام و رحمت تھی اور جس پر ایمان لانا مسلمان کے ایمان کا حصہ ہے۔ قرآن اس کی اصل تعلیمات کی تصدیق کرتا ہے اور اپنے آپ کو اس پر نگہبان قرار دیتا ہے۔ اس کے ساتھ قرآن بعض تاریخی گروہوں کی چھپائی اور تحریف کی کوتاہیوں کا ذکر بھی کرتا ہے جس کی بنیاد پر مسلم عقیدہ ہے کہ موجودہ متن کو پرکھنے کا معیار قرآن ہے۔ یہی متوازن حیثیت قرآن کو پچھلی وحی سے بیگانہ بھی نہیں کرتی اور اس کا خاتم و نگہبان بھی ثابت کرتی ہے۔

سوال نمبر 4: الہامی مذاہب کے مشترکات (20 نمبر)

سوال نمبر 4۔ الہامی مذاہب کے مشترکات بیان کریں۔ (20)

تعارف

الہامی مذاہب سے مراد وہ مذاہب ہیں جن کی بنیاد وحی و الہام پر ہے یعنی جن کے پیروکار یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے منتخب انبیا کے ذریعے انسانوں کو ہدایت بھیجی ہے۔ اس زمرے میں نمایاں طور پر یہودیت، عیسائیت اور اسلام شامل ہیں اور ان تینوں کو ان کے مشترکہ جد حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسبت سے ابراہیمی مذاہب بھی کہا جاتا ہے۔ ان مذاہب میں بہت سے اہم اختلافات موجود ہیں، مثلاً آخری نبی کی شخصیت، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حیثیت اور شریعت کی صورت، مگر ان کے مشترکات بھی اتنے گہرے اور بنیادی ہیں کہ تقابلی مطالعے میں انہیں ایک ہی خاندان سمجھا جاتا ہے۔ مشترکات کا مطالعہ اس لیے مفید ہے کہ اس سے بین المذاہب تفہیم کی بنیاد بنتی ہے، غلط فہمیاں دور ہوتی ہیں اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ الٰہی ہدایت کا بنیادی پیغام مختلف ادوار میں کس قدر یکساں رہا ہے۔ اس جواب میں مشترکات کو عقائد، عبادات، اخلاقیات، کائناتی تصور اور تاریخی و سماجی مشترکات کے عنوانات کے تحت بیان کیا جائے گا اور آخر میں اختلافات کا مختصر و متوازن ذکر بھی کیا جائے گا تاکہ تصویر یک طرفہ نہ ہو۔

بنیادی عقائد میں مشترکات

سب سے بڑا اشتراک توحید کا تصور ہے۔ تینوں مذاہب کی اصل تعلیم میں اللہ ایک ہے، وہ کائنات کا خالق و مالک ہے، وہ بے نیاز اور قدرت و علم میں کامل ہے۔ یہودیت میں شمع کی دعا میں اللہ کی وحدانیت کا اعلان کیا جاتا ہے، عیسائیت بھی اپنے آپ کو توحید پرست مذہب قرار دیتی ہے اگرچہ اس میں تثلیث کی مخصوص تعبیر موجود ہے جس پر اسلام سے اس کا اختلاف ہے، اور اسلام میں توحید سب سے مرکزی عقیدہ ہے۔ اس اشتراک کا مطلب یہ ہے کہ ان مذاہب کا خدا کوئی قبائلی یا مادی دیوتا نہیں بلکہ پوری کائنات کا واحد خالق ہے۔ یہی تصور ان مذاہب کو بت پرستی اور شرک کی تمام صورتوں سے جدا کرتا ہے اور انسان کو ایک اخلاقی کائنات کا حصہ بناتا ہے جس میں اس کا ہر عمل ایک نگران ہستی کے علم میں ہے۔

دوسرا بڑا اشتراک وحی و نبوت کا عقیدہ ہے۔ تینوں مذاہب مانتے ہیں کہ اللہ نے انبیا بھیجے اور ان پر کتابیں یا صحیفے نازل کیے جن میں توریت، زبور، انجیل اور قرآن نمایاں ہیں۔ انبیا کی ایک مشترک فہرست بھی تینوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے جن میں حضرت آدم، نوح، ابراہیم، اسحاق، یعقوب، یوسف، موسیٰ، داؤد اور سلیمان علیہم السلام شامل ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو تینوں میں خصوصی مقام حاصل ہے اور انہیں ایمان کا نمونہ قرار دیا جاتا ہے۔ تیسرا اشتراک فرشتوں اور آخرت کا تصور ہے: تینوں میں فرشتوں کا وجود، موت کے بعد کی زندگی، قیامت، اعمال کی جزا و سزا اور جنت و دوزخ کے تصورات کسی نہ کسی صورت میں موجود ہیں۔ اگرچہ ان تصورات کی تفصیلات میں فرق ہے، مگر انسان کی ابدی ذمہ داری کا بنیادی خاکہ تینوں میں مشترک ہے۔

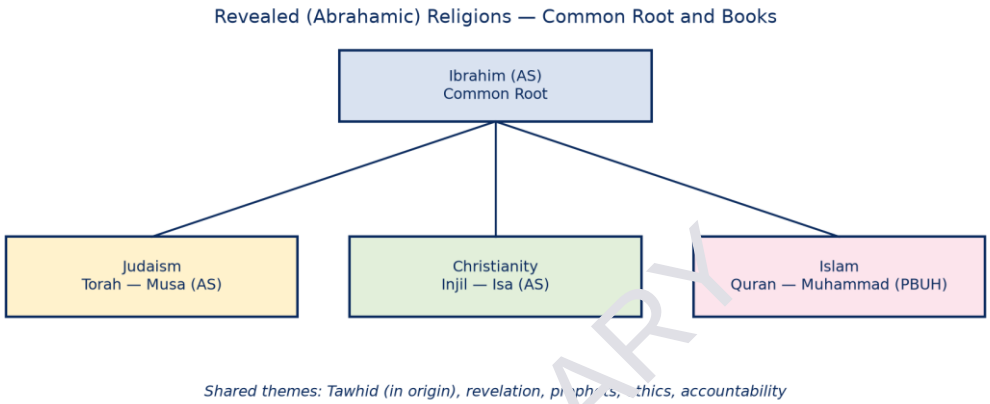

شکل 2: الہامی (ابراہیمی) مذاہب — مشترکہ جڑ اور آسمانی کتابیں (مطالعے کے لیے خاکہ)

عبادات اور مذہبی زندگی کے مشترکات

عبادات میں بھی نمایاں مشترکات پائے جاتے ہیں۔ تینوں مذاہب میں نماز و دعا کو مرکزی عبادت کی حیثیت حاصل ہے؛ یہودیت میں دن میں مقررہ دعائیں، عیسائیت میں کلیسیائی و ذاتی دعا اور اسلام میں پنج وقتہ نماز اسی سلسلے کی مختلف صورتیں ہیں۔ روزہ بھی تینوں میں موجود ہے: یہودی یوم کفارہ کا روزہ رکھتے ہیں، عیسائی روایت میں لینٹ کے روزوں کی روایت ہے اور اسلام میں رمضان کے روزے فرض ہیں۔ صدقہ و خیرات کو تینوں میں بڑی فضیلت حاصل ہے اور اسے اللہ کی رضا کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ حج و زیارت کا تصور بھی مشترک خطوط پر ہے: یہودی بیت المقدس کی زیارت کو اہمیت دیتے تھے، عیسائی مقدس مقامات کی زیارت کرتے ہیں اور مسلمانوں پر بیت اللہ کا حج فرض ہے۔ مقدس دن کا تصور بھی مشترک ہے اگرچہ دن مختلف ہے: یہود کے لیے سبت، عیسائیوں کے لیے اتوار اور مسلمانوں کے لیے جمعہ خصوصی دن ہے۔

اسی طرح مذہبی ادارے اور مذہبی قیادت کی صورتوں میں مشابہت نظر آتی ہے۔ مسجد، کنیسہ اور کلیسیا تینوں عبادت کے اجتماعی مراکز ہیں؛ امام، ربی اور پادری مذہبی رہنمائی کے کردار ہیں؛ اور خطبہ و وعظ تینوں روایات کا حصہ ہے۔ زندگی کے اہم مراحل کی رسوم یعنی پیدائش، بلوغ، شادی اور موت کے مواقع پر مذہبی مراسم بھی تینوں میں پائے جاتے ہیں۔ کھانے پینے کے حلال و حرام کے تصورات یہودیت و اسلام میں نمایاں طور پر مشترک ہیں اور عیسائیت میں بھی بعض روایات میں غذائی پابندیوں کی جھلک ملتی ہے۔

ان مشترکات سے معلوم ہوتا ہے کہ الہامی مذاہب انسان کی پوری زندگی کو عبادت و ضابطے کے دائرے میں لانے کا مشترکہ مزاج رکھتے ہیں۔

جدول 4: الہامی مذاہب کے نمایاں مشترکات (خلاصہ)

مشترک نکات	شعبہ
ایک خالق و مالک خدا، مطلق قدرت و علم، رحمت و عدل	خدا کا تصور
وحی، انبیا اور آسمانی کتابیں (توریت، زبور، انجیل، قرآن)	ہدایت کا ذریعہ
ابراہیم، موسیٰ، داؤد، سلیمان علیہم السلام کو احترام	مشترک شخصیات
قیامت، جزا و سزا، ابدی زندگی کا تصور	آخرت
دعا و نماز، روزہ، صدقہ، زیارت و مقدس دن	عبادات
سچائی، امانت، والدین کی خدمت، پڑوسی کے حقوق، ظلم کی ممانعت	اخلاق
خاندان کی اہمیت، عدل، کمزور کی حمایت و یتیم کی کفالت	سماجی تعلیم

AIOU LIBRARY aioulibrary.com

اخلاقی و سماجی تعلیمات کے مشترکات

اخلاقیات کے میدان میں مشترکات سب سے زیادہ عملی اہمیت رکھتے ہیں۔ احکامات عشرہ جن کا بیان اسی مشق میں آ رہا ہے، درحقیقت تینوں مذاہب کی اخلاقیات کا مشترکہ منشور ہیں: والدین کی اطاعت و خدمت، قتل، زنا، چوری اور جھوٹی گواہی کی ممانعت، اور دوسرے کی ملکیت کی حرص سے پرہیز۔ اسلام کی اخلاقی تعلیمات میں بھی یہی نکات مرکزی حیثیت رکھتے ہیں۔ تینوں مذاہب میں سچ بولنے، وعدہ پورا کرنے، امانت کی حفاظت، انصاف کرنے، کمزور کی مدد، یتیم و بیوہ کی کفالت اور مہمان نوازی کو بڑی اقدار قرار دیا گیا ہے۔ سود، رشوت، ظلم اور فحاشی کی مذمت بھی مشترکہ خطوط پر موجود ہے۔ یہ اشتراک اتفاقی نہیں بلکہ اس وجہ سے ہے کہ تینوں کا سرچشمہ ایک ہی الٰہی ہدایت قرار دیا جاتا ہے۔

سماجی سطح پر بھی تینوں مذاہب خاندان کو بنیاد قرار دیتے ہیں، نکاح کو مقدس رشتہ سمجھتے ہیں اور برادری وہمسائیگی کے حقوق سکھاتے ہیں۔ انسان کی عزت و تکریم کا تصور یعنی انسان کو اللہ کی تخلیق ہونے کی وجہ سے قابل احترام سمجھنا، تینوں میں پایا جاتا ہے۔ تاریخ کے مطالعے سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان مذاہب کے پیروکار صدیوں تک مشرق وسطیٰ، اندلس اور دیگر خطوں میں ساتھ رہتے آئے ہیں اور ان کے درمیان علمی ترجمے و تجارتی تعلقات کی طویل روایت موجود رہی ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ تاریخ میں تنازعات نہیں ہوئے؛ ہوئے ہیں اور ان کا علمی ذکر بھی ضروری ہے، مگر مشترکہ اقدار ان تنازعات کے حل کے لیے اخلاقی بنیاد فراہم کرتی ہیں۔ آج کے عالمی ماحول میں جب مذہبی تناؤ ایک بڑا مسئلہ ہے، مشترکات کا مطالعہ پرامن بقائے باہمی کے لیے ایک [illegible] بنیاد فراہم کرتا ہے۔

کائناتی تصور اور اختلافات کا توازن

کائناتی تصویر میں بھی مشترکات گہرے ہیں۔ تینوں مذاہب کائنات کو اللہ کی تخلیق مانتے ہیں جو ایک آغاز رکھتی ہے، انسان کو اس میں ذمہ دار خلیفہ یا امانت دار کی حیثیت دی گئی ہے اور تاریخ کو ایک بامقصد سلسلہ سمجھا جاتا ہے جس کا انجام قیامت اور عدل الٰہی پر ہو گا۔ تاریخ کا یہ خطی تصور ان مذاہب کو دور کے زمانے والے تصورات سے جدا کرتا ہے۔ انسان کی فطرت، گناہ و توبہ اور نجات کے تصورات بھی مشترک ڈھانچے میں آتے ہیں، اگرچہ ان کی تعبیرات مختلف ہیں۔ توبہ و رجوع الی اللہ کا دروازہ تینوں روایات میں کھلا قرار دیا گیا ہے اور اللہ کی رحمت کو اس کے غضب پر غالب بتایا گیا ہے۔

متوازن مطالعے کے لیے اختلافات کا ذکر بھی ضروری ہے۔ سب سے بڑا اختلاف آخری وحی کے بارے میں ہے: مسلمان حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو آخری نبی اور قرآن کو آخری کتاب مانتے ہیں، جبکہ یہود و عیسائی اس کو تسلیم نہیں کرتے۔ دوسرا بڑا اختلاف حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شخصیت کے بارے میں ہے جس کی تفصیل اگلی مشق میں آئے گی۔ تیسرا اختلاف شریعت و نجات کے راستے کی تفصیلات میں ہے۔ ان اختلافات کا ذکر کرتے ہوئے علمی ادب کا تقاضا ہے کہ ہر مذہب کا موقف اسی کی زبان اور اسی کے مآخذ سے پیش کیا جائے اور کسی مذہب کے پیروکاروں کے جذبات مجروح نہ کیے جائیں۔ مشترکات کا بیان اختلافات کو مٹانے کے لیے نہیں بلکہ باہمی احترام کی بنیاد بنانے کے لیے ہوتا ہے اور یہی اس موضوع کا اصل مقصد ہے۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ یہودیت، عیسائیت اور اسلام توحید کے بنیادی تصور، وحی و نبوت، آسمانی کتابوں، مشترک انبیا خصوصاً حضرت ابراہیم علیہ السلام، آخرت و جزا و سزا، نماز و روزے و صدقے جیسی عبادات اور احکامات عشرہ پر مبنی مشترکہ اخلاقیات میں گہرے اشتراک رکھتے ہیں۔ یہ مشترکات اس بات کا ثبوت ہیں کہ ان کا تعلق ایک ہی الہامی خاندان سے ہے، جبکہ ان کے اختلافات بھی حقیقی ہیں جنہیں علمی احترام کے ساتھ سمجھنا چاہیے۔ مطالعہ مذاہب کے طالب علم کے لیے یہ توازن ہی درست علمی رویہ ہے: نہ اختلاف کو چھپایا جائے اور نہ اشتراک کو نظر انداز کیا جائے۔

سوال نمبر 5: توریت کی کتاب خروج کے احکامات عشرہ (20 نمبر)

سوال نمبر 5۔ توریت کی کتاب خروج کے احکاماتِ عشرہ بیان کریں۔ (20)

تعارف

احکامات عشرہ یعنی دس احکام یہودیت و عیسائیت کی شریعت اور اخلاقیات کی بنیاد ہیں اور توریت کی دوسری کتاب یعنی کتاب خروج کے باب بیس میں بیان ہوئے ہیں۔ روایت کے مطابق یہ احکام طور سیناپر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو عطا ہوئے اور پتھر کی دو تختیوں پر لکھے ہوئے تھے۔ اسی مناسبت سے انہیں الواح کے احکام بھی کہا جاتا ہے۔ قرآن مجید میں الواح کا ذکر تو آیا ہے کہ ان میں ہر چیز کی نصیحت و تفصیل تھی، مگر ان دس احکام کی فہرست قرآن میں اسی ترتیب سے نہیں دی گئی؛ البتہ ان کا مضمون قرآن کی متعدد آیات میں پوری طرح موجود ہے، اور بعض سورتوں میں، خصوصاً سورہ بنی اسرائیل میں، اس سے ملتی جلتی اخلاقی ہدایات ایک سلسلے کی صورت میں بیان ہوئی ہیں۔ اس جواب میں پہلے کتاب خروج اور سینائی عہد کا تعارف دیا جائے گا، پھر دس احکام ایک ایک کر کے بیان کیے جائیں گے، ان کی درجہ بندی پر بحث ہو گی اور آخر میں ان کی اہمیت اور اسلام سے ان کی مشابہت پر نتیجہ اخذ کیا جائے گا۔ واضح رہے کہ ذیل میں احکام کا مفہوم و خلاصہ اپنے الفاظ میں پیش کیا جا رہا ہے، یہ کسی مخصوص ترجمے کا لفظ بہ لفظ اقتباس نہیں ہے۔

کتاب خروج اور سینائی عہد کا پس منظر

کتاب خروج عہد نامہ قدیم کی دوسری کتاب ہے اور اس میں بنی اسرائیل کی غلامی، خروج، صحرائی سفر اور سیناپر شریعت کے نزول کے واقعات بیان ہوئے ہیں۔ سینا کا واقعہ اس لحاظ سے فیصلہ کن ہے کہ یہاں ایک نجات یافتہ قوم کو اس کی اجتماعی زندگی کا آئین دیا گیا۔ عہد کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ نے بنی اسرائیل کو اپنی خاص قوم قرار دیا اور ان سے شریعت کی پابندی کا عہد لیا۔ احکامات عشرہ اسی عہد کی بنیادی دستاویز ہیں۔ یہودی روایت میں انہیں تمام احکام کا خلاصہ سمجھا جاتا ہے اور یہودی فقہ میں شمار کیے جانے والے چھ سو تیرہ احکام کو بھی انہی کی تفصیل قرار دیا جاتا ہے۔ عیسائی روایت میں بھی یہ احکام کیسائی اخلاقی تعلیم کی بنیاد رہے ہیں، اگرچہ بعض احکام خصوصاً سبت کی تعبیر میں مکاتب فکر میں اختلاف موجود ہے جس کا ذکر آگے آئے گا۔

تدریسی نقطہ نظر سے احکامات عشرہ کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ پہلے چار احکام کا تعلق اللہ کے ساتھ انسان کے تعلق سے ہے جن میں توحید، بت سازی سے ممانعت، نام الٰہی کے احترام اور سبت کی تقدیس شامل ہیں۔ باقی چھ احکام کا تعلق انسانوں کے باہمی تعلقات سے ہے جن میں والدین کی خدمت، قتل، زنا، چوری، جھوٹی گواہی اور حرص کی ممانعت شامل ہے۔ اس تقسیم کو دو تختیوں سے بھی جوڑا جاتا ہے کہ ایک تختی حقوق اللہ اور دوسری حقوق العباد پر مشتمل تھی۔ اسلام میں بھی حقوق کی یہی دو قسمیں اساسی حیثیت رکھتی ہیں، اس لیے یہ احکام تقابلی مطالعے میں خصوصی دلچسپی کا موضوع ہیں۔ ذیل میں ہر حکم کو مختصر وضاحت کے ساتھ پیش کیا جا رہا ہے جس میں حکم کا مفہوم، اس کا مقصد اور اس کی اخلاقی جہت بیان ہو گی۔

جدول 5: احکامات عشرہ — مختصر فہرست (کتاب خروج، باب 20؛ مفہوم کا خلاصہ)

نمبر	حکم کا خلاصہ	زمرہ
1	اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں؛ اسی کی عبادت کرو	حقوق اللہ
2	بت یا مورتی نہ بناؤ اور اسے سجدہ نہ کرو	حقوق اللہ

3	اللہ کا نام بے ادبی و بے مقصد نہ لو	حقوق اللہ
4	سبت کے دن کو مقدس رکھو اور آرام کرو	حقوق اللہ
5	اپنے ماں باپ کی عزت و خدمت کرو	حقوق العباد
6	خون ناحق نہ کرو (قتل نہ کرو)	حقوق العباد
7	زنا نہ کرو	حقوق العباد
8	چوری نہ کرو	حقوق العباد
9	اپنے پڑوسی کے خلاف جھوٹی گواہی نہ دو	حقوق العباد
10	پڑوسی کی کسی چیز کی حرص نہ کرو	حقوق العباد

AIOU LIBRARY aioulibrary.com

پہلا حکم: توحید

پہلا حکم یہ ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہو گا اور خروج کرنے والے اللہ ہی کی عبادت کی جائے گی۔ احکام کا آغاز اس اعلان سے ہوتا ہے کہ میں تیرا خدا ہوں جس نے تجھے مصر کی غلامی سے نکالا، اس کے سوا کسی کی بندگی نہیں ہو گی۔ یہ حکم پورے نظام کی بنیاد ہے کیونکہ اسی سے انسان کی وفاداری کا مرکز متعین ہوتا ہے۔ اسلام میں کلمہ توحید کا پہلا جز بھی یہی ہے اور قرآن کے بقول ہر رسول کی دعوت کا آغاز اسی کلمے سے ہوا۔ مطالعہ مذاہب میں اس حکم کو اس لیے مرکزی کہا جاتا ہے کہ باقی تمام احکام اسی کی شاخیں ہیں:

جب معبود ایک ہو گا تو عبادت، اطاعت اور اخلاق سب کا رخ درست ہو جائے گا۔

دوسرا حکم: بت سازی وبت پرستی کی ممانعت

دوسرا حکم یہ ہے کہ کوئی تراشی ہوئی مورتی یا کسی چیز کی صورت نہ بنائی جائے اور نہ اسے سجدہ کیا جائے اور نہ اس کی عبادت کی جائے۔ اس کا مقصد عبادت کو مادی صورتوں سے پاک رکھنا اور خدا کو ہر مخلوقاتی مشابہت سے بلند سمجھنا ہے۔ اسی حکم کی بنیاد پر یہودیت میں مذہبی تصویری اظہار کی پابندیوں کی روایت چلی اور عبادت خانوں میں مورتیوں سے اجتناب کیا گیا۔ اسلام میں بھی بت پرستی کی ممانعت اور مسجدوں کی سادگی اسی مزاج کی عکاس ہے، اگرچہ احکام کی جزئیات میں فرق ہے۔ عیسائی روایت میں اس حکم کی تعبیر پر داخلی اختلاف رہا ہے؛ بعض مکاتب نے تصاویر و مجسموں کو تعلیمی وسیلہ قرار دیا اور بعض نے اسے اسی حکم کے تحت ممنوع سمجھا۔ یہ اختلاف خود اس بات کی علامت ہے کہ یہ احکام زندہ تعبیری روایت رکھتے ہیں۔

تیسرا حکم: نام الٰہی کا احترام

تیسرا حکم یہ ہے کہ اللہ کا نام بے فائدہ، بے ادبی سے یا جھوٹی قسم کے لیے نہ لیا جائے۔ اس حکم کا مقصد زبان کی حرمت قائم کرنا ہے کہ مقدس نام کو کھیل تماشے یا دھوکے کا ذریعہ نہ بنایا جائے۔ قسم کے تقدس کا یہ تصور تینوں الہامی مذاہب میں موجود ہے؛ اسلام میں بھی جھوٹی قسم کو بڑا گناہ قرار دیا گیا ہے اور قسم کھا کر اسے پورا کرنے یا کفارہ دینے کا نظام مقرر ہے۔ عملی زندگی میں اس حکم کا اثر یہ ہے کہ مذہبی زبان کے وقار کی حفاظت ہو اور دینی اصطلاحات بازاری استعمال سے محفوظ رہیں۔ یہ حکم عبادت کو زبان کے اخلاق سے جوڑتا ہے اور بتاتا ہے کہ الہامی شریعت میں قول کی ذمہ داری عمل کی ذمہ داری سے کم نہیں ہے۔

چوتھا حکم: سبت کی تقدیس

چوتھا حکم سبت یعنی ہفتے کے ساتویں دن کو یاد رکھنے اور اسے مقدس رکھنے کا ہے جس میں خود، اہل خانہ، ملازمین اور حتیٰ کہ جانوروں کو بھی آرام دیا جائے گا اور کوئی کام نہیں کیا جائے گا۔ توریت میں سبت کی دو تعلیلیں بیان ہوئی ہیں: تخلیق کائنات کے چھ دنوں کے بعد الٰہی آرام کی یاد، اور مصر کی غلامی سے نجات کی یاد۔ سبت یہودی زندگی کا سب سے نمایاں ادارہ بن گیا جس کی پابندیوں کی وسیع فقہی تفصیلات وجود میں آئیں۔ اس حکم کی سماجی جہت بھی اہم ہے کہ یہ مزدور و ملازم اور جانور کے آرام کے حق کو شریعت کا حصہ

بناتا ہے۔ عیسائیت میں اتوار کو عبادت کا دن قرار دیا گیا اور سبت کی تعبیر پر مکاتب میں بحث رہی، جبکہ اسلام میں جمعہ کا دن اجتماع و عبادت کے لیے مخصوص ہوا۔ ان فروق کے باوجود ہفتے میں ایک دن خدا کی عبادت و آرام کے لیے وقف کرنے کا بنیادی تصور سب میں کسی نہ کسی صورت موجود ہے۔

پانچواں حکم: والدین کی عزت

پانچواں حکم ماں باپ کی عزت کرنے کا ہے اور اس کے ساتھ لمبی عمر اور فلاح کا وعدہ جوڑا گیا ہے۔ یہ حقوق العباد کا پہلا حکم ہے اور اس ترتیب میں یہ حکمت ہے کہ انسان کے سب سے قریبی ترین حق دار اس کے والدین ہیں۔ اس حکم نے خاندان کو یہودی سماج کی بنیاد بنایا۔ قرآن مجید میں والدین کے ساتھ حسن سلوک کا حکم توحید کے حکم کے ساتھ ساتھ متعدد مقامات پر آیا ہے اور اسے شرک کے بعد سب سے بڑی ہدایت کے انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ تینوں مذاہب کے اس اشتراک سے معلوم ہوتا ہے کہ الہامی اخلاق کی ابتدا گھر سے ہوتی ہے۔ آج کے دور میں جب بزرگوں کی دیکھ بھال ایک سماجی مسئلہ بن چکی ہے، اس حکم کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے۔

چھٹا ساتواں حکم: جان، عفت، مال، زبان اور دل کی حفاظت

چھٹا حکم قتل کی ممانعت ہے کہ ناحق خون نہ بہایا جائے۔ یہ انسانی جان کی حرمت کا اعلان ہے جسے اسلام میں بھی ایک انسان کے قتل کو پوری انسانیت کے قتل کے برابر قرار دینے کے اسلوب میں بیان کیا گیا ہے۔ ساتواں حکم زنا کی ممانعت ہے جو عفت و خاندانی استحکام کی حفاظت کرتا ہے۔ آٹھواں حکم چوری کی ممانعت ہے جو دوسرے کی ملکیت و محنت کے احترام کو یقینی بناتا ہے۔ یہ تینوں احکام بالترتیب جان، نسل و عفت اور مال کی حفاظت کرتے ہیں، اور یہی وہ بنیادی مقاصد ہیں جنہیں اسلامی شریعت کے مقاصد میں بھی مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ اس مشاہدے سے واضح ہوتا ہے کہ الہامی شریعتوں کی اخلاقی سرگرمیوں کا محور انسان کی بنیادی ضرورتوں کی حفاظت ہی رہا ہے۔

نواں حکم پڑوسی کے خلاف جھوٹی گواہی کی ممانعت ہے۔ اس حکم کا تعلق عدل و قضا سے ہے کہ عدالت میں جھوٹ بولنا پورے نظام انصاف کو تباہ کر دیتا ہے۔ اسلام میں جھوٹی گواہی کو شرک کے ساتھ ذکر کر کے بڑے گناہوں میں شمار کیا گیا ہے۔ دسواں اور آخری حکم پڑوسی کے گھر، بیوی، ملازم، مال یا کسی بھی چیز کی حرص نہ کرنے کا ہے۔ یہ حکم اس لحاظ سے منفرد ہے کہ یہ ظاہری عمل سے آگے بڑھ کر دل کی کیفیت کو موضوع بناتا ہے۔ چوری عمل ہے جبکہ حرص اس کی جڑ ہے؛ شریعت نے نتیجے کے ساتھ جڑ کو بھی روکا

ہے۔یہی اندرونی اخلاق کی تعلیم بعد میں عیسائی و اسلامی اخلاقیات میں بھی نمایاں رہی جہاں گناہ کی ابتدا خیال سے سمجھی جاتی ہے۔یوں دسواں حکم احکامات عشرہ کو قانون سے بڑھا کر روحانی تربیت کا نظام بنا دیتا ہے۔

احکامات عشرہ کی اہمیت اور اسلام سے تقابل

احکامات عشرہ کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ یہودی روایت انہیں تمام شریعت کا خلاصہ کہتی ہے اور عیسائی روایت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بھی تمام شریعت کا خلاصہ اللہ سے محبت اور پڑوسی سے محبت کے دو بڑے احکام میں بیان فرمایا، جو درحقیقت انہی احکام کے دو حصوں کی تعبیر ہے۔اسلامی نقطہ نظر سے ان احکام کا مضمون بڑی حد تک قرآن کی تعلیمات سے ہم آہنگ ہے؛ فرق عمدتاً سبت جیسے خاص ادارے اور تاریخی عہد کی خصوصیت میں ہے۔اس ہم آہنگی کی وجہ یہی ہے کہ مسلمان کے عقیدے کے مطابق ان کا اصل ماخذ بھی وحی ہے۔طالب علم کے لیے یہ تقابل بین المذاہب تفہیم کی عمدہ مثال ہے کہ اختلاف کے باوجود اخلاقی بنیادیں کس قدر مشترک ہیں۔

جدید دور میں بھی احکامات عشرہ قانون و اخلاق کی تاریخ میں حوالہ بنے ہوئے ہیں۔مغربی قانونی روایت کے کئی اصول، جیسے جھوٹی گواہی کی سزا، مالکیت کا تحفظ اور والدین کے حقوق، اپنے تاریخی سلسلے میں انہی احکام سے جڑے ہیں۔اسکولوں اور عدالتوں میں ان کی نمائش پر ہونے والی جدید مباحث اس بات کا ثبوت ہیں کہ یہ احکام آج بھی ثقافتی اہمیت رکھتے ہیں۔پاکستانی طالب علم کے لیے ان کا مطالعہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ اس سے یہ سمجھنے میں مدد ملتی ہے کہ مذہبی قانون کس طرح معاشرے کی اخلاقی بنیادیں فراہم کرتا ہے، اور یہ سبق خود اسلام کے قانونی نظام کو سمجھنے میں بھی مددگار ہوتا ہے۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ توریت کی کتاب خروج میں بیان کردہ احکامات عشرہ سینائی عہد کی بنیادی دستاویز ہیں: پہلے چار احکام توحید، بت پرستی سے پرہیز، نام الٰہی کے احترام اور سبت کی تقدیس کے ذریعے حقوق اللہ متعین کرتے ہیں، اور باقی چھ احکام والدین کی خدمت اور جان، عفت، مال، عدل و زبان اور دل کی حفاظت کے ذریعے حقوق العباد کا نظام قائم

کرتے ہیں۔ ان کا مضمون قرآن کی اخلاقی تعلیمات سے بڑی حد تک ہم آہنگ ہے جو ان کے الہامی ماخذ کی دلیل سمجھا جاتا ہے۔ یہی احکام آج بھی یہودیت و عیسائیت کی

اخلاقیات اور عالمی قانونی ثقافت میں زندہ اثر رکھتے ہیں۔

AIOU LIBRARY
aioulibrary.com